ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

موجودہ درسی کتابوں کے نقائص

ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں سائنسی علوم یعنی طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم کی درسی کتابیں ناقص ہیں اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہنی نشوونما کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں ایسے مغربی مُصنّفین کی لکھی ہوتی ہیں جن کا نقطہ نظر کائنات اور انسان اور علم اور تعلیم کے متعلق کم از کم جہاں تک ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کا تعلق ہے درست نہیں۔ ہم نے ان کتابوں کو سوچے سمجھے بغیر مغرب کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے اور ہر بات میں ان کی فوقیت کے دام میں مبتلا ہو کر اپنے ہاں نافذ کر رکھا ہے۔

مثلاً پہلے طبیعیاتی عُلوم کی درسی کتابوں کو لیجیے۔ ان علوم میں فزکس کیمسٹری اور اسٹرانومی وغیرہ شامل ہیں اور ان سب کے لیے طبیعیات یا فزکس کا مختصر نام بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ان علوم کی درسی کتابوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کا مواد اس غلط مفروضہ یا عقیدہ پر مبنی ہے کہ صداقت صرف وہی ہے جسے ہم براہِ راست اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکتے ہوں۔ جو چیز ہم اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کر سکتے، وہ یا تو موجود ہی نہیں یا پھر اگر موجود ہے تو اسے ہم جان نہیں سکتے، لہٰذا وہ معدوم کے حکم میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مفروضہ میں خدا اور خودی اور ان کی صفات کا انکار شامل ہے۔ لیکن اس مفروضہ کے غلط ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ یہ خود اپنی تردید کرتا ہے۔ اگر یہ مفروضہ فی الواقع صحیح ہے اور سچائی پر مبنی ہے تو ہم اسے ایک صداقت قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ اس مفروضہ کو کسی شخص نے براہِ راست حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ ایک عقیدہ یا مفروضہ ہے، یہ مفروضہ اپنی تردید خود کر دیتا ہے۔ مغرب کے علماءِ طبیعیات اس مفروضہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ طبیعیات کو کسی ایسے عقیدہ سے آغاز نہیں کرنا چاہیے جو سائنسی طریقوں سے یعنی براہِ راست حواسِ خمسہ کے مشاہدہ سے ثابت شدہ نہ ہو۔ لیکن ان کا یہ اصول خود ایک عقیدہ ہے جو سائنس کے طریقوں سے ثابت شدہ نہیں اور اس کی وجہ

یہ ہے کہ ان کا عقیدہ پہلے موجود ہوتا ہے اور ان کی سائنسی تحقیق بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی سائنسی تحقیق اس عقیدہ کو ثابت نہیں کرتی بلکہ ان کا یہ عقیدہ ان کی سائنسی تحقیق کی تشکیل کرتا ہے۔ اس طرح سے جب مغربی مفکرِ مابعد الطبیعیات اپنی سائنسی تحقیق کو اس عقیدہ سے شروع کرتا ہے کہ سائنسی تحقیق کو کسی عقیدہ سے شروع نہیں ہونا چاہیے تو وہ اپنی تردید خود کرتا ہے اور اس بات کا ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے کہ جس عقیدہ سے وہ اپنی سائنس شروع کرتا ہے وہ غلط ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی سائنس دان اپنی سائنس کو ایک عقیدہ سے ہی شروع کرتا ہے لیکن آخر مغرب کے سائنس دان یہ کہنے کے باوجود کہ سائنس کو کسی عقیدہ سے آغاز نہیں کرنا چاہیے اس بات پر مجبور کیوں ہیں کہ اپنی سائنس کا آغاز ایک عقیدہ سے کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان فقط محبّت کا ایک جذبہ ہے اور محبّت کسی مقصود یا مطلوب کے عمدہ یا حسین ہونے کے عقیدہ کا دوسرا نام ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کا کوئی فعل ایسا بھی ہو جو کسی عقیدہ پر مبنی نہ ہو مثلاً ہر فعل سے پہلے اس کا فاعل یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کا یہ فعل فلاں مقصد کو حاصل کرے گا اور اس کو انجام دینے کا فلاں طریقہ عمدہ اور حسین ہے اور یہ عقیدہ اگرچہ معمولی سا نظر آتا ہے لیکن آخر کار حقیقتِ کائنات کے کسی تصوّر سے یا کسی نظریۂ زندگی سے ماخوذ ہوتا ہے۔ سائنسی تحقیق بھی چونکہ ایک انسانی فعل ہے وہ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اور ممکن نہیں کہ وہ اس عقیدہ سے آغاز نہ کرے۔

یہاں یہ سوال کیا جائے گا کہ مغربی ماہر طبیعیات کا یہ مفروضہ کہ صداقت وہی ہے جس کا مشاہدہ ہم براہ راست حواسِ خمسہ سے کرتے ہیں اگر سائنسی طریقوں سے ثابت شدہ نہیں تو پھر اس کی عقلی اور علمی بنیاد کیا ہے اور اسے کس بنا پر سائنسی تحقیق کا راہ نما عقیدہ بنا دیا گیا ہے۔ حیرانی کی بات تو یہی ہے کہ اس کی عقلی اور علمی بنیاد کوئی نہیں اور پھر بھی مغرب کے ماہرینِ طبیعیات نے اسے طبیعیات کی علمی اور عقلی جستجو کی راہ نمائی کرنے والے ایک عقیدہ کا مقام دے دیا ہے۔ یہ مفروضہ دراصل بعض لوگوں کے گٹھ جوڑ کا باہمی سمجھوتہ تھا جو مذہبِ عیسائیت کی ضرورتوں اور مصلحت اور سیاست کے بعض تقاضوں کی بنا پر عمل میں لایا گیا تھا اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ سائنس اور سائنسدانوں کو کلیسا سے بچانے کے لیے بعض بہانوں سے خدا کے عقیدہ کو جو پہلے سائنس میں موجود تھا سائنس سے خارج کر دیا جائے۔ مغرب کے علمی حلقوں میں بھی اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے سائنس کا مخصوص طریقِ تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی وہ اسپین کے مسلمان تھے اور یہ لوگ سائنس کے موجد اس لیے بنے کہ ان کے لیے قرآن حکیم کا ارشاد تھا کہ مظاہر قدرت

کا مشاہدہ کر کے خدا کو پہچانو۔ چنانچہ انہوں نے خدا کی معرفت کی جستجو میں مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور ان سے جو نتائج حاصل کیے ان کو ضبطِ تحریر میں لاتے۔ آج ہم اسی قسم کے نتائج کو سائنس کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے ان پہلے سائنس دانوں کی سائنس خدا کے عقیدہ سے پیدا ہوئی تھی لہٰذا خدا کا عقیدہ اس کا مدار و محور تھا۔ لیکن جب ہسپانوی مسلمانوں کے حالات نے پلٹا کھایا اور وہ اسپین سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو پولسیت (PAULISM) یا جدید عیسائیت کے پیرو تھے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین پاک اور مقدّس ہے اور دنیا ناپاک اور غیر مقدّس۔ لہٰذا سائنس جو دنیا سے تعلق رکھتی ہے دین سے الگ راستہ نکالتی ہے اور دین کو خراب کرتی ہے۔ لہٰذا اہلِ کلیسا نے سائنس اور سائنس دانوں کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا اور سائنسدانوں نے اپنا بچاؤ اسی میں سمجھا کہ سائنس سے خدا کا عقیدہ نکال کر اس کو ایک خالص دنیاوی اور پلید قسم کی کارروائی کا درجہ دے دیں تو پھر اس کے خلاف کلیسا کو شکایت کا موقع نہیں رہے گا۔

اسی اثنا میں کلیسا اور ریاست کے افتراق نے اسے ایک شدید سیاسی ضرورت بنا دیا۔ کیونکہ ممکن نہیں تھا کہ پوپ کے اثر و نفوذ کو سائنسی علوم اور مکتب کے چور دروازہ سے داخل ہو کر بادشاہ کے کام میں دخل انداز ہونے کی اجازت دی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی درسی کتابوں سے خدا کا عقیدہ خارج کر دیا گیا۔ سائنس کی بے خدائیت کو ایک علمی رواج اور فیشن کی شکل دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے سائنس دانوں اور فلسفیوں نے نادانستہ اور غیر شعوری طور پر اپنے استدلال پر جبر کرنا شروع کر دیا اور قدرتی بے ساختہ اور معقول استدلال کے جس راستہ پر انہیں خدا کا تصوّر دُور سے سامنے نظر آتا وہ اپنے استدلال کو زبردستی اس راستہ سے ہٹا کر ایک اور راستہ پر ڈال دیتے تاکہ خدا کا تصوّر راستہ میں آنے نہ پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انیسویں صدی کے نظریۂ مادیّت اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا ایسے سائنسی نظریات سائنس کی بے خدائیت کے رواج کے مطابق ڈھلنے لگے تو لوگ رفتہ رفتہ بھول گئے کہ یہ رواج ایک مذہبی عقیدہ پر اور ایک مصلحت اور سیاسی ضرورت پر مبنی ہے اور اس کی عقلی اور علمی بنیاد کوئی نہیں اور غلطی سے یہ سمجھنے لگے کہ یہ سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے اور آج تک ایسا ہی سمجھا جاتا ہے اگرچہ انیسویں صدی کی مادیت اور ڈارون کے میکانکی نظریۂ ارتقا کو بھی اب نئے حقائق نے روند ڈالا ہے۔ اگر حسی صداقت کا مفروضہ مغربی سائنسدانوں کا کوئی علمی اصول ہوتا اور محض خدا کے عقیدہ کے خلاف ان کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ نہ ہوتا تو وہ ہر غیر حسی صداقت کو مسترد کر دیتے۔ لیکن وہ اس اصول کو

کام میں لا کر صرف خدا ہی کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ اور باقی ہر صداقت کو جو ثابت ہو سکے خواہ وہ براہِ راست مشاہدہ میں آئے یا نہ آئے قبول کرتے ہیں اور اس طرح سے ثابت کرتے ہیں کہ اُن کا یہ مفروضہ غلط ہے صداقت وہی نہیں جسے ہم براہِ راست اپنے مشاہدہ سے معلوم کریں بلکہ وہ بھی ہے جسے ہم براہِ راست مشاہدہ سے تو معلوم نہ کر سکیں لیکن اس کے اثرات اور نتائج کو براہِ راست مشاہدہ سے معلوم کر سکیں۔ اس کی مثال ایٹم ہے۔ ایٹم کا جس قدر علم سائنس دانوں کو آج تک حاصل ہوا ہے، وہ اس کے براہِ راست مشاہدہ پر نہیں بلکہ اس کے آثار و نتائج کے مشاہدہ پر اپنا دار و مدار رکھتا ہے۔ خدا کا وجود بھی ایک ایسی ہی حقیقت ہے جس کا علم ہم اُس کے براہِ راست مشاہدہ سے حاصل نہیں کرتے بلکہ مظاہرِ قدرت کی صورت میں اُس کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اگر مغرب کے سائنس دان ایٹم کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے ایٹم کو ایک سائنسی حقیقت سمجھتے ہیں تو مظاہرِ قدرت میں خدا کے آثار و نتائج کے مشاہدہ سے خدا کو ایک سائنسی حقیقت کیوں نہیں سمجھتے، اس کی وجہ سائنس کی بے خدائیت کا وہی پرانا نامعقول رواج، خدا کے تصور سے وہی پرانا ڈر اور اس کے خلاف وہی پرانا تعصب ہے جو کلیسا کی سائنس دشمنی سے پیدا ہوا تھا۔

جس چیز نے طبیعیات کے علم کو ممکن بنایا ہے وہ یہ ہے کہ طبیعیاتی مظاہرِ قدرت میں ایک نظم یا (ORDER) پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نظم ایک ایٹم میں، ایک سالمہ میں ایک کرسٹل میں۔ برف کے ایک گالہ میں نظامِ شمسی میں بلکہ ہر مادی مظہرِ قدرت میں موجود ہے اور یہ نظم اس قدر جچا تُلا ہے کہ ہم اسے ہمیشہ ریاضیاتی اعداد و رموز میں بیان کر سکتے ہیں۔ اس کنکری کی بڑھتی ہوئی رفتار بھی جو ایک اُونچے مکان کی چھت سے نیچے گرائی گئی ہو اور لوہے کی اس سلاخ کی بڑھتی ہوئی طوالت بھی جسے گرم کیا جا رہا ہو ریاضیات کے ایسے اٹل قوانین سے مطابقت رکھتی ہے، جو کائنات میں اُس وقت بھی اپنا کام کر رہے تھے جب ہنوز دنیا میں کوئی ریاضیات جاننے والا بلکہ کوئی انسان اور کوئی متنفس بھی موجود نہ تھا۔ ان قوانین کو کس ذہن نے سوچا تھا؟ جدید طبیعیات کی تحقیق کے مطابق مادہ فنا ہو جاتا ہے اور اگر کائنات کو برقرار رکھتے ہوئے اُسے رفتہ رفتہ کائنات سے نکال دیا جائے تو مادی مظاہرِ قدرت کے اندر جو چیز باقی رہ جائے گی وہ کچھ خیالی ڈھانچے اور کچھ ریاضیاتی نسبتیں ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لازوال اور اٹل ریاضیاتی نظم کو سوچنے والا ذہن ہی مادی مظاہرِ قدرت کی بنیادی حقیقت ہے۔ اگر ان میں یہ نظم موجود نہ ہوتا یا زمان و مکان کے لحاظ سے وہ ہر وقت اور ہر جگہ مسلسل اور یکساں نہ ہوتا تو طبیعیات کی سائنس ممکن نہ ہوتی۔ ماہرِ طبیعیات

کا کام یہی ہے کہ وہ ان مظاہرِ قدرت میں نظم دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب کسی مظہرِ قدرت میں یہ نظم دریافت کر لیتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس کی سائنس ایک قدم اور آگے بڑھ گئی ہے اور جب دریافت نہیں کر سکتا تو سمجھتا ہے کہ ابھی اس کی سائنس اس سمت میں ترقی نہیں کر سکتی۔

لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قدرت میں نظم کی موجودگی کسی دارائے علم و حکمت اور اختیار و قدرت رکھنے والے ذہن یا شخصیّت کی تخلیقی کارروائی کی معتبر علامت ہے۔ اگر مکّی کے کچھ دانے سڑک پر بکھرے ہوئے ہوں تو آپ کہہ سکیں گے کہ شاید وہ سڑک پر جانے والے کسی چھکڑے سے اتفاقاً گر گئے ہیں۔ لیکن اگر وہی دانے ایک باقاعدہ ہشت پہلو ریاضیاتی شکل میں آراستہ ہوں تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ کسی ایسے ذہن کی تخلیق ہے جو ریاضیاتی انداز میں سوچ سکتا ہے اور حُسن اور کمال کا ذوق رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی ایسے جنگل میں جائیں جس کے متعلق یہ بات مشہور ہو کہ اس میں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا اور آپ اچانک کسی خوبصورت جھونپڑی کے پاس آنکلیں جس کے صحن میں سبزہ اور پھولوں کی کیاریاں بھی ہوں تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ کسی ذہن یا شخصیّت کی تخلیقی کارروائی کا نتیجہ ہے اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ اس جنگل میں کبھی کوئی انسان نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ نظم کے اندر مقصد بھی شامل ہے کیونکہ نظم کی تخلیق اور تکمیل خود ایک مقصد ہے اور مقصد ایک شخصیّت ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ طبیعیات کا محقق اپنے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت سے نظم کی جستجو کر کے اور اسے دریافت کر کے یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ کس کا ذہن ہے اور یہ کون سی شخصیّت ہے جس کی تخلیقی کارروائی اور مقصدیت مادّی کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں آشکار ہے۔ اس سوال کا عقلی اور علمی جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو تخلیق کی قدرت اور علم اور حکمت اور حسن اور کمال کی محبت کے اوصاف رکھتا ہے اور چونکہ اس کا پیدا کیا ہوا نظم ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی رہتا ہے لہٰذا خالقِ کائنات ایک ہی ہے۔ یہ سوال چونکہ طبیعیات کی درسی کتاب پیدا کرتی ہے اس کا جواب بھی درسی کتاب ہی کو دینا چاہیے، کسی اور کتاب کو نہیں لیکن مغرب کا ماہرِ طبیعیات اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتا ہے بلکہ اس کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ اور اس کی وجہ وہی سائنس کی بے خدائیت کا نامعقول رواج ہے لیکن ہمیں اس رواج کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم طبیعیاتی علوم کی درسی کتابوں کو نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ جہاں جہاں ہم نظم کے ثبوت پر پہنچیں وہاں اس نظم کو خالقِ کائنات کی تخلیقی کارروائی کی ایک شہادت کے

طور پر بیان کریں اور اس کا کوئی ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیں تاکہ طالب علم کے دل میں خدا کی محبّت کا جوہر پیدا ہو اور اپنے کمال کو پہنچے۔

اب حیاتیاتی علوم کی درسی کتابوں کی طرف آیئے۔ ان علوم میں زوآلوجی اور باٹونی وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔ ان علوم کی درسی کتابوں کا مواد بھی حسّی صداقت کے نامعقول مفروضہ سے دبا ہوا ہے حالانکہ حیاتیاتی مظاہرِ قدرت میں نظم اور مقصد کے اوصاف جو کسی خلّاق علیم کی تخلیقی کارروائی کی معتبر علامت ہوتے ہیں، مادّی مظاہرِ قدرت سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک سیل (CELL) یا خلیہ نظم اور مقصدیّت کا حیرت انگیز شاہکار ہے اسی طرح سے ایک زندہ جسم حیوانی اور اس کا ہر عضو صرف آنکھ اور کان کی تخلیق میں علم حکمت اور قدرت کے جو کمالات بروئے کار آتے ہیں ان پر ایک بڑی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ایک زندہ جسم حیوانی کے اندرونی حیاتیاتی وظائف مثلاً عملِ انہضام اور اس کی حیاتیاتی کیمیا، حیاتین اور زناقین کی تیاری دورانِ خون، سانس کی آمد و رفت، تناسل ایک خاص طے شدہ جسمانی شکل کی جانب حیوان کی خودکارانہ نشو و نما اس کے اعضائے رئیسہ کا خودکارانہ عمل، زخموں کا خود بخود بھرنا اور بیماریوں کے خلاف صحت بحال کرنے والا خود بخود ظہور پذیر ہونے والا ردِّ عمل ان میں سے ہر وظیفہ ثابت کرتا ہے کہ حیوان کی پیدائش اور نشو و نما ایک ایسے ذہن کے قادرانہ اور حکیمانہ تصرّف میں ہے جو خود حیوان کا ذہن نہیں لہٰذا حیاتیات کی درسی کتابوں کا مواد بھی یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ ذہن کس کا ہے اور اس سوال کا عقلی اور علمی جواب بھی یہی ہے کہ کسی قادرِ مطلق خالقِ کائنات کا۔ لیکن یہاں مغرب کا درسی کتاب لکھنے والا پھر اس سوال کے جواب میں خاموش رہتا ہے۔ وہ یا تو حیاتیاتی مظاہرِ قدرت میں نظم اور مقصد کی موجودگی بالکل تسلیم ہی نہیں کرتا یا اگر تسلیم کرتا ہے تو اس طرح سے کہ کسی خالقِ کائنات کا تصوّر اس کی درسی کتاب میں راہ نہ پا سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ارتقاء کو جو خالقِ کائنات کی عالمگیر ربُوبیت کا ایک شاندار اور یقین افروز مظہر ہے، قدرت کی بے جان اور بے مقصد میکانکی قوتوں کی اندھا دھند کارروائی کا اتفاقی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اگر اس کی بات کو صحیح مانا جائے تو یہ بھی طالب علم کو ماننا پڑتا ہے کہ اگر قدرت کی یہی بے بصر قوتیں کسی اور طرح سے کام کرنے لگ جائیں تو ممکن ہے کہ آج جو انسان ہے وہ انسان نہ ہوتا بلکہ گندگی میں رینگنے والا کوئی کریہ المنظر کیڑا ہوتا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم حیاتیاتی علوم کی درسی کتابوں کو خود نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ حیاتیاتی مظاہرِ قدرت کے اندر نظم اور مقصد کی تشریح کرتے ہوئے اسے خدا کی تخلیقی کارروائی کا نتیجہ قرار دیں اور ایسا کرتے ہوئے ہر موقعہ سے جو درسی کتاب کے مضمون کے اندر پیدا ہو فائدہ اٹھائیں

نفسیاتی یا انسانی علوم میں مغرب سے مانگی ہوئی درسی کتابوں کے نقائص اور بھی زیادہ نمایاں اور افسوسناک ہیں ان میں وہ تمام علوم شامل ہیں جو انسان کے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ اقتصادیات، فلسفۂ قانون، فلسفۂ تعلیم، فلسفۂ ہنر، فلسفۂ تاریخ، نفسیاتِ فرد اور نفسیاتِ جماعت وغیرہ۔ ان کو نفسیاتی علوم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی اعمال کے علوم ہیں اور انسانی اعمال کی جڑ انسان کی فطرت یا اس کی نفسیات میں ہے۔

مغرب میں یہ علوم محض بے ربط اور پراگندہ خیالات کے مجموعے ہیں اور ان کی حالت اس قدر خراب ہے کہ بعض مغربی حکما ان کو علوم کے معزز نام سے یاد کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی حکما کو انسان کی فطرت کا ہی علم نہیں اور وہ نہیں جانتے کہ انسانی افعال کا سرچشمہ اور ان کا مقصد اور مدعا کیا ہے۔ ان علوم کی خراب حالت کے متعلق خود کچھ کہنے کی بجائے میں آپ کے لیے مغرب کے ایک نامور ماہرِ نفسیات میکڈوگل کی کتاب "انتشارِ عالم" (WORLD CHAOS) سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔

"فطرتِ انسانی کے بارہ میں ہماری لاعلمی اب تک تمام انسانی اور اجتماعی علوم کی ترقی کے لیے سدِ راہ بنتی رہی ہے اور اب بھی بنی ہوئی ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانہ کی ایک شدید ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ شاید مکمل تباہی کے شدید خطرہ کا سامنا کر رہی ہے۔ ہم علم نفسیات، علم اقتصادیات، علم سیاسیات، قانون، معاشرت اور اس کے علاوہ اور بہت سے فرضی علوم کا ذکر کرتے رہتے ہیں لیکن سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دل کش نام فقط ہمارے علم کے خلاؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فقط ان کے وسیع و عریض بے آباد صحراؤں کی واضح نشان دہی کرتے ہیں جن کی سیاحت ابھی تک نہیں کی گئی۔ لیکن یہ صحرا وہ ہیں کہ اگر ہماری تہذیب نے زندہ رہنا ہے تو ہمیں ان کو کسی قاعدہ کے تحت لانا ہی پڑے گا۔ میرا ادعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے توازن کو بحال کرنے کے لیے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کا علم (منظم کیا ہوا آراستہ کیا ہوا علم یا سائنسی علم) اس سے بہت زیادہ درکار ہے جو ہمیں اب تک حاصل ہوا ہے۔

لہٰذا یہ ہے وہ ایک ہی طریقِ کار جس سے ہم اپنی تہذیب کو موجودہ غیر یقینی اور دن بدن زیادہ خطرناک ہونے والی حالت کا مداوا کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے انسانی اور اجتماعی علوم کو پوری کوشش کے ساتھ ترقی دے کر فطرتِ انسانی اور اس کی [illegible] علم کی شکل دینی چاہیے۔ انسانی اور

> اجتماعی علوم کی بنیاد دریافت کرنے اور ان کے طرقِ ترتیب و تدوین کو بہم پہنچانے کی ضرورت آج اتنی شدید ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ تو پھر عملی نقطۂ نظر سے علاج کیا نکلا۔ مَیں اپنے جواب کو مختصر طور پر پیش کرنے کے لیے یہ بتاؤں گا کہ اگر مَیں ڈکٹیٹر ہوتا تو کیا کرتا . . . . مَیں ہر ممکن طریق سے اس بات کی کوشش کرتا کہ ہمارے بہترین دماغوں کو طبیعیاتی علوم سے ہٹا کر انسانی اور اجتماعی علوم میں تحقیق کے کام پر لگا دیا جائے۔"
>
> (ورلڈ کیاس، صفحات ۹، ۵۹، ۱۱۲، ۱۱۵)

حکمائے مغرب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی فطری خواہشات میں سے ایک خواہش ایسی ہے جو اس کے تمام اعمال کی قوّتِ محرّکہ ہے جو اس کی دوسری تمام خواہشات پر اور تمام اعمال پر حکمران ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے تمام سیاسی، اخلاقی، اقتصادی، علمی، فنی، قانونی، جنگی اعمال اس خواہش کے مظاہر ہیں اور جب تک ہم اس خواہش کو نہ جانیں ہم ان اعمال میں سے کسی عمل کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کا کوئی فلسفہ لکھ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مغرب کے حکماء نے آج تک ان اعمال کے جو فلسفے لکھے ہیں وہ انسان کی اُس خواہش کو جاننے کے بغیر لکھے ہیں جو اس کے اعمال کی قوتِ محرکہ ہے۔ لہٰذا اگر یہ فلسفے خود اُن کو مطمئن نہ کر سکیں اور ان کے اپنے خیال کے مطابق بے ربط خیالات کے پلندے ہوں تو اس میں تعجب کی بات کوئی نہیں۔

مغرب کے حکماء کی نگاہ ابھی تک اس حقیقت پر نہیں پڑی کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ نصب العین کی محبت ہے جو فقط خدا کے نصب العین سے مکمّل اور مستقل طور پر مطمئن ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حسی صداقت کا مفروضہ ان کے آڑے آتا ہے اور وہ کسی ایسی صداقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ خدا کے تصوّر کو علم کے اندر لانے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن ہمیں کون سی چیز مانع ہے کہ ہم ان انسانی اور اجتماعی علوم کی درسی کتابوں کو اس حقیقت کی روشنی میں نئے سرے سے لکھیں کہ خدا کی محبّت انسان کے اعمال کی اصلی قوّتِ محرکہ ہے اور جب ایک انسان خدا کو نہ جانتا یا نہ سمجھتا ہو تو وہ اپنے اس جذبۂ محبت کی تشفی کسی غلط نصب العین کی محبت سے کرتا ہے اور اس کی طرف خدا کی صفات منسوب کرتا ہے تاکہ اپنی غلطی کو مکمل کر کے اپنے اس جذبہ کی مکمل تشفّی کا اہتمام کرے۔